مطالعہ کتاب

لوحِ ایام

انقلاب ایران کا پس منظر و پیش منظر

رفیع الدین ہاشمی

اردو میں انقلاب ایران (۱۹۷۹) کے بارے میں ذاتی مشاہدات اور تاریخی و سیاسی تجزیوں پر مشتمل بہت سی تحریریں سامنے آئی ہیں۔ ان میں سے بعض تو ایران سے باہر بیٹھ کر محض کتابوں اور ذرائع ابلاغ کی مدد سے مرتب کی گئی ہیں اور بعض چند دنوں' ہفتوں یا زیادہ سے زیادہ دو چار مہینوں کے سفر و مشاہدے کو بنیاد بنا کر لکھی گئی ہیں۔ زیر نظر کتاب جناب مختار مسعود کے چار سالہ قیام ایران کے چشم دید واقعات اور عمیق مشاہدے اور تجزیاتی مطالعے کا ماحصل ہے۔ وہ آر سی ڈی کے سیکرٹری کے طور پر ۱۹۷۸ میں ایران گئے اور پورے چار سال وہاں مقیم رہے۔ اسی دوران انقلاب برپا ہوا۔ یہ مصنف کی زندگی کا ایک نیا اور انوکھا تجربہ تھا۔۔۔

مصنف ہماری سول سروس کے ان گنے چنے افراد میں سے ہیں جن کا قلم و قرطاس سے گہرا تعلق ہے۔ بیورو کریسی کے خلاف پائی جانے والی ایک عمومی فضا میں اس حلقے کے کم لوگوں کے بارے میں اچھی رائے پائی جاتی ہے' مختار مسعود کا شمار انھی کم لوگوں میں ہے (زبان خلق کو۔۔۔) ایک ادیب کے طور پر "آواز دوست" اور "سفر نصیب" نے بھی انھیں ناموری عطا کی ہے اور بجا طور پر۔ لیکن ان کی زیر نظر کتاب پہلی متذکرہ بالا دونوں کتابوں سے خاصی مختلف ہے۔ تقریباً پانچ سو صفحات اور سترہ ابواب پر مشتمل' چار سال کی طویل مدت پر پھیلی ہوئی اس داستان کو جو غم جاناں اور غم دوراں دونوں کا مرقع ہے' حکایت جہاں بھی ہے اور حدیث دل بھی' احاطہ تحریر میں لانا آسان نہ تھا مگر مصنف نے اس حکایت لذیذ کو اس فنکاری اور ہنرمندی سے سمیٹا ہے کہ اگر دراز تر بھی ہوتی تو بار خاطر نہ ہوتی۔ بلکہ جی چاہتا ہے کاش کچھ اور طویل ہوتی۔

سفر ایران کا پروگرام بنا تو مصنف نے باقاعدہ اس کے لیے ہوم ورک شروع کر دیا۔ میز پر کتابوں کا ڈھیر' ہیروڈوٹس' طبری' ول ڈیورنٹ' آربری' براؤن۔ ایک دوست نے یہ ڈھیر دیکھا اور طنزاً کہا: آپ تہران جانے

کے لیے تیاری کر رہے ہیں یا کسی امتحان میں بیٹھنے کے لیے؟ (ص ۲۰)۔ بہرحال سفر یا امتحان کی تیاری جاری رہی۔ اس سلسلے میں مصنف نے بہت سے ایران پلٹ لوگوں سے بھی ملاقاتیں کیں۔ ملاقات و مشاورت کا سلسلہ ایران پہنچ کر بھی جاری رہا اور مطالعے کا ذوق وہاں پہنچ کر سوا ہو گیا۔ کتابوں کی دکانوں کے پھیرے، کتابوں کا انتخاب، پھر لغت کی مدد سے ان کا مطالعہ۔ پندرھواں اور سولھواں باب "افکار" اور "اشعار" اسی مطالعے کا نچوڑ ہیں۔ وہ ہمیں شریعتی، مطہری، صادق ہدایت اور جلال آل احمد سے متعارف کراتے ہیں۔ اس حصے میں بہت دلچسپ باتیں ہیں، مثلاً:

استاد مطہری نے ملا نصرالدین کا ذکر مغربی جمہوریت کے سلسلے میں کیا ہے۔ ملا خچر پر بیٹھے کہیں جا رہے تھے۔ پوچھا: کہاں جا رہے ہو؟ کہنے لگے: "جہاں یہ خچر لے جائے"۔ مغربی جمہوریت ملا نصرالدین کا خچر ہے۔ اکثریت معاشرہ کو جہاں چاہے لے جائے، کوئی اسے روکنے یا ٹوکنے والا نہیں ہوتا۔ اکثریت چاہے تو جائز کو ناجائز قرار دے دے اور معقول کو نامعقول۔ حرام کو حلال کا مرتبہ بخش دے۔ گناہ کو ثواب کا درجہ عطا کر دے جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔ جس جمہوری نظام میں اکثریت کو حسن قرار دیا جائے اور قانون سازی اور کرشمہ سازی میں فرق جاتا رہے، اس میں حیوانیت آزاد اور انسانیت اسیر ہوتی ہے۔ جو لوگ اللہ کو فراموش کر دیتے ہیں، اللہ ان کو فراموش کر دیتا ہے اور اکثریت کے گمان فاسق پر چلنے دیتا ہے تاکہ وہ اپنے انجام کو پہنچیں۔

"مغربی دیماکراسی (Democracy) کے بارے میں مطہری اور اقبال کے خیالات ملتے جلتے ہیں۔ اتنا ہے کہ ایک نے گدھے کی مثال دی ہے اور دوسرے نے خچر کی کہ از مغز دو صد خر فکر انسانی نمی آید۔ گدھے خواہ دو سو ہی کیوں نہ ہوں وہ انسان کی طرح سوچنے سے معذور ہیں۔ اس واضح فرق کے باوجود پاکستان نے مغربی دیماکراسی کے خچر پر سواری کی ہے اور بنیادی جمہوریت کے گدھے پر بھی۔ تین چار بار اس بے بس سوار کو رسالے کا تیز گام گھوڑا لے کر بھاگ گیا۔ منزل ہر بار کھوٹی ہوئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اب لوگ گھوڑے، گدھے اور خچر کسی پر بھی اعتبار نہیں کرتے۔ سارا الزام سواری کے جانور پر رکھتے ہیں۔ اپنا قصور کسی کو نظر نہیں آتا" (ص ۴۳۶)۔

ایرانی انقلاب کے پس منظر کی تلاش میں مصنف تقریباً نصف صدی پیچھے جاتے ہیں جب ۱۹۵۰ میں شہنشاہ ایران پہلی مرتبہ پاکستان آئے تھے اور یہاں ان کا بڑا پرجوش استقبال ہوا تھا۔ صرف لاہور میں انھیں کم از کم ۱۰ لاکھ افراد نے دیکھا۔ ایران کے لیے خیرسگالی کے برادرانہ جذبات عروج پر تھے۔ شہنشاہ نے چند سال بعد دوبارہ پاکستان کا دورہ کیا اور ان کے خاندان کے افراد بھی باری باری پاکستان کے دورے پر آنے لگے۔ کبھی سیر و تفریح اور شکار کے لیے اور کبھی ثقافتی دوروں پر۔ ۱۹۶۵ کی جنگ میں ایران نے پاکستان کی بھرپور مدد کی اور شہنشاہ نے پندرہ سولہ سالہ مہمانی کا حق ادا کر دیا مگر اس کے بعد دونوں ملکوں کے درمیان خیر

سکّاں کی فضا میں کمی ہوتی گئی۔ اور اس کا سبب یہ تھا کہ شاہ ایران رفتہ رفتہ تیل کی دنیا کا بادشاہ بن گیا۔ "اس شخص کے تکبر کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ اس نے قرآن مجید کا ایک خوبصورت نسخہ طبع کرایا ہے مگر اپنے پیش لفظ اور دستخط کے ساتھ" (ص ۶۱)۔ محمد رضا شاہ نے خود کو اردشیر سے بڑا اور سائرس کے برابر سمجھنا شروع کر دیا تھا۔

مختار مسعود بتاتے ہیں کہ ایک دوست نے وزیر خارجہ سے ملاقات کا حال سنایا۔ یزدی کا کہنا تھا کہ شاہ کے دور کے جس معاملے کی چھان بین کرتے ہیں' اس کا ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے اور وہ یہ کہ ایران میں امریکہ کی عملداری مکمل اور ہمہ گیر تھی۔ امریکہ اپنے قبضہ و اختیار کا استعمال کرنے میں بڑا بے لحاظ' بے باک اور نامعقول تھا۔ مثال کے طور پر ایران نے امریکہ کی وزارت دفاع کے نام ایک بلین ڈالر کا چالو کھاتہ کھولا ہوا تھا۔ یہ سرمایہ گرداں تھا' جس قدر خرچ ہوتا' اس قدر رقم اس حساب میں ایران سے منتقل ہو جاتی تاکہ پیشگی کی سطح برقرار رہے۔ اس کھاتے پر امریکہ کا مکمل کنٹرول تھا۔ جو دفاعی سامان' وہ چاہتے' بھیج دیتے۔ مال کی قیمت' جو وہ چاہتے لگا لیتے۔ علی الحساب مزید رقوم مانگتے۔ حساب کبھی مانگا گیا' نہ کبھی دیا گیا۔ ایران میں کسی سرکاری ادارے کو یہ معلوم نہیں کہ اس مد میں اب تک کل خرچ کتنا ہوا ہے اور کن چیزوں پر ہوا ہے۔

مصنف نے شاہ کی غلط کاریوں کی طویل فہرست کا بھی کچھ ذکر کیا ہے۔ ساواک' بیسویں صدی کی تاریخ ایران کا خون آلود باب ہے۔ ۲۰ سال تک اس نام کی دہشت ایران پر مسلط رہی اور انقلاب کے بعد اسی قدر شدید نفرت۔ ساواک کے کوئی پونے دو لاکھ مخبر تھے۔ ایک بس اسٹینڈ پر لوگ کھڑے تھے۔ گرمی بہت تھی۔ بس کے انتظار میں قطار باندھ کر کھڑے ہونے والے پانچ سات افراد نے آپس میں گفتگو شروع کر دی۔ ایک نے صرف اتنا کہا کہ آج کل بڑا حبس ہے۔ قطار سے ایک ساواکی ایجنٹ نکلا اور اس نے یہ جملہ کہنے والے کو گرفتار کر لیا۔ کہیں سے فوراً ایک موٹر آ گئی قیدی کو اس میں ڈالا اور یہ جا' وہ جا۔ "جرم" یہ تھا کہ اس شخص نے جان کر ذو معنی جملہ کہا تھا۔ باب نمبر ۱۲ کا آخری جزو ساواک کے تذکرے پر مشتمل ہے۔ ایرانی انقلاب کے پس منظر کے تذکرے میں مصنف کو قدم قدم پر وطن عزیز کا خیال دامن گیر رہتا ہے۔ چنانچہ یہ باب اس طرح ختم ہوتا ہے:

"آج تک پاکستان میں قوم اور ملک کے کسی مجرم کے خلاف کارروائی نہیں کی گئی۔ وڈیرے ہی کیا کم تھے کہ لٹیرے بھی ان کے ساتھ اقتدار میں شامل ہو گئے ہیں۔ سمت بدلتی جا رہی ہے۔ جدھر منہ ہونا چاہیے ادھر پشت ہے۔ مسائل بڑھتے جا رہے ہیں جنھیں حل کیا جانا چاہیے انھیں ہوا دی جا رہی ہے۔ آگ لگی ہوئی ہے۔ بجھاتا کوئی نہیں۔ تاریخ سے جو عہد' برعظیم کے مسلمانوں نے کیا تھا' اسے حکومتیں توڑ رہی ہیں۔ نئی نسلیں اس عہد سے ناآشنا اور بے تعلق ہیں۔ محبتیں عنقا ہو گئی ہیں۔ حرام عام ہو گیا ہے۔ مسجد کی عمارت میں شگاف پڑ گیا ہے۔ زندگی کا بوجھ اٹھائے نہیں اٹھتا۔ گدھ منڈیروں پر آن کر بیٹھ گئے ہیں۔ اے

پاکستانیو! تمھاری غیرت' جرات اور دور اندیشی کو کیا ہو گیا ہے؟ فرشتوں کا انتظار کر رہے ہو؟ جب تک تم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو' وہ نہیں آئیں گے۔ اٹھو! قربانی دو! وہ شہیدوں کے لہو کی خوشبو سونگھ کر آجائیں گے۔ یاد رہے کہ وہ خود نہیں آتے' انھیں کوئی بھیجا کرتا ہے' تم اس کی اطاعت کرو' وہ تمھارا حامی و ناصر ہو گا۔ پہلے بھی ایسا ہوتا آیا ہے اب بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ کم ہمتی کیسی؟ ناامیدی کس لیے؟ امید مرد مومن ہے خدا کے راز دانوں میں" (ص ۳۸۷)۔

"لوح ایام" کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ مصنف ایرانی انقلاب کی داستان لکھتے لکھتے بار بار فلیش بیک کر کے وطن عزیز' اور ابنائے امت کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں۔ بسااوقات شخصی حوالے سے یادوں کے سیلاب میں بہہ جاتے ہیں۔ علی گڑھ' لاہور' سول سروس کا تربیتی عرصہ' ایام ملازمت کے تجربات اور مشاہدات' جن میں پاکستانی حکمرانوں کا تذکرہ بھی ہے اور بیورو کریسی سے وابستہ اپنے ہم پیشہ دوستوں کا ذکر بھی۔ خود نوشت کے یہ ٹکڑے بھی ایرانی انقلاب کی کہانی سے کم دلچسپ نہیں۔ "علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سکول کی چوتھی جماعت پاس کر کے پانچویں میں پہنچے تو اختیاری مضامین کے بارے میں پہلی بار طلبہ سے رائے لی گئی۔ "کلاس ماسٹر نے مضمون کے لیے باری باری ہماری رائے معلوم کی۔ جب فارسی کی باری آئی تو میں نے بڑے کیف و سرور سے اپنا ہاتھ اٹھا دیا"۔ آگے چل کر خصوصاً ایران کے زمانہ قیام میں یہ فارسی بہت کام آئی مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک حسرت بھی باقی رہ گئی۔ مختار مسعود کہتے ہیں: "عربی کی باری آئی اور میرے دل میں کسک اٹھی کہ میں ہاتھ اٹھانے والوں میں شامل نہیں ہوں۔ ماسٹر جواد کہتے ہیں کہ "ایک شخص بنگالی زبان محض اس لیے سیکھ رہا ہے کہ وہ ٹیگور کو پڑھ سکے۔ ادھر مسلمانوں کی اولاد کلام اللہ کی وارث ہونے کے باوجود عربی زبان سیکھنے سے جی چراتی ہے"۔۔۔ یہ جملہ مصنف کے کانوں میں گونجتا رہتا ہے اور ایک کسک زندگی بھر ساتھ رہتی ہے۔

ایک بلند پایہ ادیب کی تحریر میں بہت سی دوسری خوبیوں کے ساتھ بالعموم بار بار ایک دردمندی و دل سوزی کا احساس ابھرتا ہے۔ دوران ملازمت' فائلوں کی چھانٹی کرتے ہوئے مختار مسعود کو قائداعظم کے باورچی کا قصہ معلوم ہوا تھا۔ کہتے ہیں کہ جب میں نے باورچی والی فائل پڑھی تو اپنی محرومی کا احساس بہت بڑھ گیا۔ کاش کچھ پہلے اس دنیا میں آجاتے اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے کہ عظیم اور بااصول انسان کیسا ہوتا ہے۔ ہم نے جو زمانہ دیکھا ہے اور دیکھ رہے ہیں اس میں اتنے دیانت دار سربراہ حکومت اور ریاست کا تصور بالکل افسانوی لگتا ہے۔

قائداعظم کھانا بہت کم کھاتے تھے۔ دبلے پتلے بوڑھے اور بیمار تھے۔ مرض الموت میں جسمانی کمزوری بہت بڑھ گئی۔ زیارت میں قیام کے دنوں میں ڈاکٹر الٰہی بخش نے تشویش ظاہر کی کہ کم خوراکی کی وجہ سے ان کی حالت زیادہ تیزی سے خراب ہو رہی ہے۔ ان کی رائے تھی کہ لاہور میں جو باورچی کپور تھلہ برادرز کے

نام سے مشہور ہیں انھیں زیارت بھیجا جائے کیونکہ ان کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا قائداعظم کو مرغوب ہے۔ کپور تھلہ کے باورچی بھائیوں کی تلاش ہوئی۔ وہ لاہور چھوڑ کر لائل پور چلے گئے تھے۔ لائل پور سے زیارت پہنچے۔ کھانا پکایا۔ اس روز قائداعظم نے چند لقمے شوق سے کھائے۔ کھانے کے بعد اپنے پرائیویٹ سیکرٹری فرخ امین کو بلایا۔ کھانے میں فرق کی وجہ دریافت کی۔ وجہ بتائی گئی۔ وہ ناخوش ہوئے۔ چیک بک منگائی۔ باورچیوں کے آنے جانے کے خرچ کا حساب کیا۔ اس رقم کا چیک کاٹا۔ رقم سرکاری خزانہ میں جمع کرائی۔ باورچی رخصت کیے اور کہا: یہ حکومت یا ریاست کا کام نہیں کہ وہ گورنر جنرل کو اس کی پسند کا کھانا (سرکاری خرچ پر) فراہم کرے۔

"کہاں قائداعظم، سچے، کھرے، بااصول اور امانت دار۔ کہاں جھوٹے، منافق، بے اصول اور خائن حکمرانوں کی کھیپ کی کھیپ۔ کہاں وہ باورچیوں کا سفر خرچ حکومت کو واپس کرنے والا مخلص، کہاں یہ کھاؤ اڑاؤ اشخاص۔ یہ مسرف اور متلف حکومتیں۔ یہ فضول خرچیاں، یہ ضیافتیں، یہ خیانتیں، یہ حرام کاریاں۔ جیسے ملک کی دولت کو کھانا اور ویران کرنا حکمرانوں کے سرکاری فرائض میں شامل ہو اور اس کا مینڈیٹ انھیں اس جعلی دماکراسی سے ملا ہو جو مارشل لا کے درمیانی وقفوں میں عوام پر مسلط ہو جاتی ہے۔ یہ حکمران کیا کچھ نہیں کھا گئے۔ پلاٹ اور پرمٹ، ادارے اور بنک، انصاف اور اصول، دماکراسی اور مساوات، عہد اور نظریہ، روایات اور ماضی۔ اس رفتار سے یہ حکمران مملکت خداداد کو اور یہ حکومتیں ہمارے مستقبل کو کھا جائیں گی۔ نعوذ باللہ" (ص ۴۷۹)۔

مصنف نے ایران جانے سے پہلے (جیسا اوپر ذکر ہوا) سفر کی بہ خوبی تیاری کی تھی، ایران پہنچے تو انقلاب ان کے سامنے برپا ہوا۔ انھوں نے آنکھیں کھلی رکھیں۔ محض بالکنی میں کھڑے ہو کر انقلاب کا نظارہ نہیں کیا اور صرف مشاہدے ہی کو کافی نہیں سمجھا بلکہ متلاشیان انقلاب کے ہجوم میں بذات خود جا شامل ہوئے۔ ان کے دلوں کی دھڑکنوں اور ان کے جذبات سے ہم آہنگ ہوئے اور اظہار جذبات کے طور طریقوں سے واقف۔ انھوں نے ایرانی معاشرے کے اکابر و اصاغر سے رابطہ کیا، انقلاب کے علمبرداروں، پاسداروں، عالموں، خطیبوں، مفکروں، مصنفوں اور دانش وروں سے ملاقاتیں کیں۔ براہ راست مطالعہ بھی کیا--- اس لیے ان کا مطالعہ و تجزیہ حقیقت پسندانہ ہے، اس میں نہ تو رومانویت ہے اور نہ جذباتی خوش فہمیاں، شہنشاہیت کے جبر و مظالم کا طویل سلسلہ اور ردعمل میں احتجاج، ہڑتال، مظاہرے، جلوس، نعرے: مرگ بر شاہ، درود بر خمینی، مرگ بر امریکہ--- ہنگامے، گولی، آتش زنی، دھماکے، کرفیو، خانہ جنگی، بغاوت، ہلاکتیں اور شہادتیں--- سڑک، ریل، بس، ہوائی جہاز بند--- بنک، یونی ورسٹی بند، منصوبے ملتوی۔ افراتفری، لاقانونیت، نراجیت۔ شاہ کی رخصتی اور خمینی کی آمد--- انھوں نے ایرانی انقلاب کے علمبرداروں کو ان کی جرات، خود اعتمادی، خودداری اور غیرت مندی پر بجا طور پر خراج تحسین پیش کیا ہے۔ مگر مسلم ہے کہ

انقلاب میں ہمیشہ سے کچھ عبرت کے پہلو ہوتے ہیں اور کچھ سبق آموزی کے بھی۔ "لوح ایام" کے مصنف نے ایرانی انقلاب کی خود سری کے بہت سے واقعات بیان کیے ہیں۔ انقلاب میں بسا اوقات دوست اور دشمن میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ شریعتی انقلاب کے معماروں میں سے تھے لیکن یہ کیسا عبرت ناک پہلو ہے (مختار مسعود بتاتے ہیں) کہ انقلاب کے بعد ان کے بارے میں گرم جوشی کم ہوتی گئی۔ پہلے یوم وفات پر تو ایک آدھ بیان آیا' دو چار مضامین نکلے' اور تین چار بار ٹیلی ویژن پر ذکر ہوا' لیکن اس سے اگلے سال' جب شریعتی کے والد کے فلیٹ کے باہر لوگ سڑک پر جمع ہو گئے اور جلسے کی صورت بن گئی اور پچھلے سال بھی ایسا ہی جلسہ ہوا تھا تو چند ایمبولینس گاڑیاں آئیں اور سڑک کا اگلا اور پچھلا حصہ بند کر دیا۔ ایمبولینسوں کے عقبی دروازے کھلے۔ ان میں سے مسلح افراد نکل آئے اور ہجوم پر پل پڑے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہجوم منتشر ہو گیا۔ سنا ہے زخمی ہونے والوں میں شریعتی کے بوڑھے والد بھی شامل تھے (ص ۴۴۳)۔ شاید اسی لیے ایک الوداعی تقریب میں جناب مختار مسعود نے' ایک ایرانی نوجوان کو تنبیہ و تلقین کرتے ہوئے کہا کہ بڑے بڑے انقلاب ایک درجہ کامیاب ہونے کے بعد غلط رخ پر نکل جاتے ہیں اور ساری محنت اکارت جاتی ہے۔ آپ اس بات کا خاص طور پر خیال رکھیں (ص ۴۸۶)۔

"لوح ایام" کے مطالعے سے انقلاب کے بارے میں کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ بعض اوقات مصنف کچھ سوالات اٹھاتے ہیں تو وہ بہت سے ذہنوں کی ترجمانی کر رہے ہوتے ہیں۔ بتاتے ہیں کہ ایک پاکستانی صحافی نے ایران کے دانش ور عالم ڈاکٹر بہشتی سے انٹرویو لینے کے بعد' بڑے تردد اور تامل کے ساتھ آخری سوال یہ کیا کہ "انقلاب ایران کے بارے میں یہ تاثر کہاں تک درست ہے کہ یہ شیعی اسلامی انقلاب ہے؟ ڈاکٹر بہشتی نے لحہ بھر دیر نہ لگائی۔ سوال پوچھنے والے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور کہنے لگے۔ اس سوال کے جواب میں کوئی اشکال ہے نہ دشواری۔ ایران کے اسلامی انقلاب کو ایرانی علما کی قیادت اور رہبری میسر آئی ہے۔ چونکہ یہ علما شیعہ ہیں اس لیے وہ اپنے افکار اور عقیدے کے سوا اور کون سا انقلاب برپا کر سکتے ہیں" (ص ۴۴۵)۔

"لوح ایام" مصنف کے تجربات و مشاہدات اور مطالعہ و تاثرات کا حاصل ہے۔ یہ فیصلہ کرنا ذرا مشکل ہے کہ انھوں نے تاریخ نویسی کی یا وقائع نگاری' سفرنامہ لکھا ہے یا رپورتاژ' یہ ان کی خود نوشت کی ایک جھلک ہے یا یاد نگاری کا نمونہ--- مگر بہ آسانی اور بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ جو کچھ انھوں نے لکھا ہے' وہ پڑھنے کے لائق ہے' اور ان کا قاری مایوس نہیں ہوتا۔ غالباً اسی لیے یہ' ایک ہی برس کے اندر پانچویں بار چھپی ہے (فیروز سنز' لاہور) اور یہ مقام کسی اردو کتاب کو کم ہی نصیب ہوتا ہے۔